۱۵ جون ۱۹۷۱ء

ہفتہ وار

ہماری زبان

جلد ۳۰ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | شمارہ ۲۳

اس شمارے میں

اداریہ نوٹ

اردو گھر کی تعمیر کیلئے ٹھیکہ دے دیا گیا

اردو گھر کے لئے جو ٹینڈر طلب کئے گئے تھے وہ کرنل بشیر حسین زیدی اور جنرل سکریٹری کی موجودگی میں ۳۱ مئی کو کھولے گئے۔ تین ٹنڈر تھے۔ ایک آٹھ لاکھ کا، دوسرا سات لاکھ تینتالیس ہزار کا اور تیسرا سات لاکھ اڑتیس ہزار کا، موخر الذکر دو ٹھیکوں پر غور و خوض کرکے بعض مدوں میں تخفیف کرائی گئی اور اس کے بعد حساب کیا گیا تو دونوں ٹھیکے قریب قریب برابر نکلے، بالآخر جون کو شینن اینڈ لائل کمپنی (GHANON AND LYAL) کو ٹھیکہ دیا گیا۔ اخراجات کا تخمینہ اب سات لاکھ سے کچھ اوپر ہے ٹھیکیدار نے فوراً کام شروع کرنے کی تیاری کردی ہے۔ تعمیر کی مدت پندرہ مہینے مقرر کی گئی ہے، اس ٹھیکیدار نے جونی نیشنل ہسپتال کی توسیع، آسٹریلیا کے ہائی کمشنر کا دفتر اور فورڈ فاؤنڈیشن کا دفتر تعمیر کیا ہے اور اس کا کام قابل تعریف سمجھا جاتا ہے اب جبکہ تعمیر کا کام شروع ہو رہا ہے، انجمن کو سنہ ۱۹۷۱ء میں مزید تین لاکھ روپے بہرحال جمع کرنے ہیں، انجمن کے ہمدردوں، ریاستی شاخوں، مقامی شاخوں اور مجلس عام کے ممبروں کو چندے کی مہم تیز کرنی چاہئے تاکہ مقررہ وقت میں اردو گھر کی تعمیر مکمل ہو سکے۔

اردو رسم الخط میں اصلاح کیلئے تجاویز

یہ بات تو اب روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی ہے کہ اردو دنیا اپنے موجودہ رسم الخط کو باقی رکھنا چاہتی ہے اور اس کی جگہ دیوناگری یا رومن رسم الخط اختیار کرنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہاں موجودہ "تدریس اور طباعتی ضروریات کے لئے رسم الخط میں جزوی اصلاحات کا سوال دوسرا ہے۔ اصلاحات کے مسئلے کو خالص افادی اور علمی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے اور جو اصلاحات ناگزیر سمجھی جائیں ان کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ انجمن نے کچھ عرصہ ہوا ایک سوالنامہ جاری کیا تھا جس کے اسّی سے اوپر جوابات موصول ہوئے تھے۔ ان میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ رسم الخط تو باقی رکھا جائے، ہاں اس میں انجمن کی ۱۹۴۲ اور ۱۹۴۴ء کی تجاویز کی روشنی میں جو زیادہ تر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کی مرتب کردہ تھیں، اصلاحات کی گنجائش ضرور ہے ادبی مجلس نے ۲۸ مئی کے جلسے میں جنرل سکریٹری کی یہ تجویز منظور کرلی تھی کہ اس سوالنامے کے جو جوابات موصول ہوئے تھے، انھیں ایک مقدمے کے ساتھ، ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اشاعت کے لئے مرتب کردیں، مجلس عام نے بھی اس تجویز کی منظوری دے دی تھی۔ امید ہے کہ یہ کتابچہ جلد اشاعت کے لئے تیار ہو جائے گا۔ درس و تدریس اور

اخبارات، رسائل اور کتب کی طباعت کے لئے رسم الخط میں چند جزوی اصلاحات واقعی ضروری ہیں۔ امید ہے کہ انجمن کی تجاویز کے شایع ہو جانے کے بعد اردو کے مصنف اور ناشران پر ہمدردی سے غور کریں گے۔ ایسے معاملات میں کوئی فتویٰ تو نہیں دیا جاسکتا، لیکن علمی دنیا اگر بعض اصلاحات پر متفق ہو جائے تو رفتہ رفتہ ان کے نفاذ کے لئے فضا ہموار ہو جاسکتی ہے۔

"اجتماعی علوم" پر رسالہ

انجمن کے کاموں پر ریویو کرنے کے لئے حکومت ہند نے جو کمیٹی مقرر کی تھی اس کو جنرل سکریٹری نے توجہ دلائی تھی کہ انجمن اردو ادب کے علاوہ ایک اور سہ ماہی رسالہ اجتماعی علوم پر شایع کرنا چاہتی ہے۔ ریویونگ کمیٹی نے جنرل سکریٹری کی یہ سفارش منظور کرلی اور حکومت ہند سے اس رسالے کے لئے پانچ ہزار سالانہ کی امداد دینے کی سفارش کی ہے۔ انجمن کی ادبی مجلس نے اس رسالے کے دائرہ کار کا تعین کرنے اور اسے چلانے کے لئے مناسب مشورہ دینے کے لئے ماہرین کی ایک کمیٹی مقرر کی ہے جس میں دہلی یونی ورسٹی، جواہر لال نہرو یونی ورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اجتماعی علوم کے عالم اور اسکالر شامل ہیں۔ کمیٹی کا پہلا جلسہ جولائی میں ہوگا اور ہمیں توقع ہے کہ اکتوبر ۱۹۷۱ء سے ہم اس رسالے کا آغاز کرسکیں گے۔ اس وقت اردو میں اجتماعی علوم پر ایسے مضامین اور کتابوں کی خاص ضرورت ہے جو جدید معلومات کی روشنی میں لکھے جائیں۔ تاریخ، سیاسیات، عمرانیات، اقتصادیات، نفسیات کی تعلیم میں بیسویں صدی میں بڑی ترقی ہوئی ہے اور جب تک ہم ان علوم کے جدید ترین نظریات سے واقف نہ ہوں، اردو دوستوں میں جدید ذہن پیدا نہیں کرسکتے۔ جدید ذہن پیدا کرنے کا یہ مقصد نہ ہوگا کہ ہم اپنے پرانے سرمائے سے بے نیاز ہو جائیں۔ اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ایک طرف ہماری نظر اپنے ماضی کے سرمائے پر گہری ہو، دوسری طرف ہم میں ایک تنقیدی صلاحیت پیدا ہو جس کی بدولت ہم معروضی طور پر تمام معلومات کو پرکھ سکیں اور ان کے ذریعہ سے زندگی کا ایک جامع تصور پیدا کرسکیں۔ یقین ہے کہ انجمن کے اس اقدام کا مناسب خیر مقدم ہوگا۔ کمیٹی کے اجلاس کے بعد اس کی سفارشات ہماری زبان میں شائع کی جائیں گی۔

چودھری برہم ناتھ دت کی کتاب "ذکر و فکر" پر سرکاری انعام

علمی و ادبی حلقوں میں اس خبر سے مسرت ہوگی کہ پدم شری چودھری برہم ناتھ دت صاحب کو ہند سرکار کی طرف سے ان کی کتاب "ذکر و فکر" پر اس سال ایک ہزار روپیہ کا انعام ملا ہے۔

اب تک موصوف کو اردو میں اُن کی ادبی خدمات پر ۸ انعام اور دو خطاب مل چکے ہیں۔ اس سے پہلے پنجاب سرکار مختلف مواقع پر ان کو ۷ انعام عطا کر چکی ہے۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں پنجاب سرکار نے سپاسنامہ پیش کیا اور گیارہ سو روپیہ نقد کے ساتھ ان کو ادیب اعظم کے خطاب سے نوازا تھا۔ سنہ ۱۹۶۶ء میں حکومت ہند نے ان کو پدم شری کا خطاب عطا کیا۔ چودھری صاحب موصوف ملک کے ان چند نامور اور سربرآوردہ ادیبوں میں ہیں۔ جن کی ادبی خدمات کی سرکاری اور عوامی سطح پر دل کھول کر پذیرائی ہوئی ہے۔

• ادارہ

حضرت بسمل سعیدی کو گرانقدر خطاب!

ملک کے ادبی حلقوں میں یہ خبر انتہائی مسرت سے پڑھی اور سنی جائے گی کہ ملک کے مقتدر نغز گو شاعر حضرت بسمل سعیدی کو ان کے چوتھے مجموعہ کلام "اوراقِ زندگی" کی تقریب رسم اجرا کے موقعہ پر ہز ہائی نس ٹونک عزیز الدولہ وزیر الملک نواب محمد اسمٰعیل صاحب نے بطور قدردانی و حوصلہ افزائی چار ہزار روپیہ انعام اور "ممتاز الشعرا لسان الملک" کے گرانقدر خطاب سے سرفراز فرمایا۔ اس موقع پر ٹونک کے ارباب ذوق کی طرف سے بھی ایک ہزار ایک روپیہ کی تھیلی پیش کی گئی۔

• سکریٹری انجمن ترقی اردو

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند

انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کا سالانہ اجلاس اس سال پہلی، دوسری اور تیسری اکتوبر ۱۹۷۱ء کو لکھنؤ یونیورسٹی لکھنؤ میں منعقد ہوگا۔ کانفرنس کے صدر پروفیسر آل احمد سرور اور مجلس استقبالیہ کے صدر پروفیسر نور الحسن ہاشمی ہوں گے۔

لکھنؤ کے اس اجلاس میں اردو یونیورسٹی کی تجویز پر ایک خاص سمپوزیم منعقد کیا جائے گا۔ جو حضرات مقالات پڑھنا چاہیں وہ ڈاکٹر محمد حسن جوائنٹ سکریٹری انجمن اساتذہ اردو شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کو بھیج دیں۔ کوشش کی جارہی ہے کہ مہمانوں کے قیام و طعام کا انتظام پہلے کی طرح انجمن اساتذہ اردو کی طرف سے ہو۔

• خواجہ احمد فاروقی جنرل سکریٹری

حسرت سہروردی

نارجیلستان

(ضلع ملیبار کا پہلا اردو رسالہ)

حال ہی میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق کے خطوط ڈاکٹر عبدالحق کرنولی کے نام کتابی شکل میں شائع ہوئے ہیں۔ جب میں ان کا مطالعہ کر رہا تھا تو نارجیلستان کا ذکر نظر سے گزرا میرے تعجب کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ملابار اور اردو رسالہ! خیر مجھے اس رسالے کو دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ بڑی تلاش کی لیکن ناکام رہا چند دن پیشتر میرے ایک معزز دوست مولانا فلکی سے باتوں باتوں میں اس کا ذکر کیا۔ مولانا کا تعلق ملیبار سے ہے انھوں نے وعدہ کیا کہ ضرور اس کی تلاش کریں گے، ان کی تلاش کامیاب رہی۔ آج اسی گمشدہ کڑی سے متعلق چند باتیں پیش کر رہا ہوں۔

نارجیلستان غالباً ۲۸ء ۱۹۱۹ اپریل میں نکلا تھا، میرے پیش نظر جو شمارہ ہے وہ مئی ۱۹۲۸ء کا ہے جس پر جلد ۱ نمبر ۲ لکھا ہے۔ سرورق پر یہ عبارت درج ہے۔

"ضلع ملابار کا پہلا اردو رسالہ مذہبی، تاریخی اور اصلاحی مضامین کا مجموعہ"

سرورق ہی پر مولانا ظفر علی خاں اور مولانا سیماب اکبر آبادی کا ایک ایک تہنیتی شعر درج ہے۔

مولانا ظفر علی خاں:۔

نارجیلستان میں گلستان علمی کا سماں
دیکھنا ہے گر ان آنکھوں سے تو مالابار چل

مولانا سیماب:۔

وسعتیں مل جائیں گی اردو کو اس میدان میں
باثر ہوگی یہ کوشش نارجیلستان میں

مدیر کا نام سید ہارون ندوی لکھا ہے اور نیچے قیمت درج ہے سالانہ ڈھائی روپیہ فی پرچہ ۴ آنے۔ سرورق کے دوسرے صفحے پر تین نام درج ہیں۔ مدیر اعزازی اعجاز حسین صدیقی اکبر آبادی مالک: عبدالکریم سیٹھ اختر اور نگراں مولانا محوی صدیقی لکھنوی، مقام اشاعت تلیچری ملابار۔ یہ اعجاز حسین صدیقی غالباً فرزند سیماب مدیر شاعر ہیں۔

فہرست مضامین میں اداریہ کے علاوہ دو مضامین اور دو نظمیں قابل ذکر ہیں۔ (۱) "تاریخ ہند میں ملیبار کی اہمیت" از جناب محمد حمید اللہ صاحب ایم اے۔ ایل۔ ایل۔ بی (۲) "ہماری درسگاہیں اور شاعری" از مولانا سیماب اکبر آبادی۔

پہلے مضمون والے محمد حمید اللہ صاحب آج کے مشہور زمانہ ماہر اسلامیات ڈاکٹر حمید اللہ ہیں جو پیرس یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر ہیں۔ جب یہ مضمون انھوں نے لکھا ہوگا تو وہ زمانہ ان کی تحقیقی زندگی کا اوائلی زمانہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ اس دور میں بھی انھوں نے تحقیق کا حق ادا کر دیا ہے۔ ان کی تحقیقی اپچ کے سلسلے میں چند ایک اقتباسات اس مضمون سے پیش ہیں۔

"فان لون (VAN LOON) اپنی "تاریخ امریکہ" میں لکھتا ہے کہ ملیبار کے مرچ مسالے کی یورپ کو کچھ ایسی چاٹ لگی ہوئی تھی کہ صلیبی جنگوں کے بعد جب سلطان اور عرب تاجروں نے یورپ سے بائیکاٹ کر لیا اور ان مزیدار چیزوں کا بھیجنا بند کر دیا تو کولمبس اس سیاہ مرچ کے ملک کی تلاش میں سمندروں میں مدتوں سرگرداں رہا اور اس نے ہندوستان کا سمندری راستہ معلوم کرنے ہی کی حسرت میں آخر جان دیدی"

اردو زبان کی ابتدا سے متعلق رقمطراز ہیں۔

"اس کو بھی چھوڑئیے موجودہ ہندوستانی زبان کہاں پیدا ہوئی؟ پنجابی کہتے ہیں پنجاب میں دہلوی کہتے ہیں دلی میں حیدر آبادی کہتے ہیں حیدر آباد میں مگر اس سے سب متفق ہیں کہ ہماری ہندوستانی زبان مسلمانوں اور ہندوؤں کے میل جول سے پیدا ہوئی اس میل جول کا آغاز کیا ملیبار سے پہلے کہیں ہوا ہے؟ پنجاب دلی اور حیدر آباد سے سیکڑوں برس پہلے عرب تاجر ملیبار آیا جایا کرتے تھے۔ پہلی صدی ہجری ہی کے وسط میں ہزارہا عرب ملیبار اور سندھ میں آکر بس چکے تھے"

علامہ سیماب کا جو مضمون چھپا ہے اس میں "گزشتہ سے پیوستہ" لکھا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپریل کے شمارے میں جو پہلا شمارہ بھی تھا اس مضمون کا آغاز ہوا تھا۔ یہ شاید دوسری قسط ہے۔ اس مضمون میں علامہ نے ہماری شاعری شاعر اور مشاعروں کے تعلق سے اسی زمانے میں بڑی چبھتی ہوئی باتیں کی ہیں۔ اس سے بھی دو ایک اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں جس سے مولانا کے طرز تحریر اور ان کے خیالات پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہم نے اپنی شاعری کو خود ہی وجہ نفرت بنا رکھا ہے۔ ہم نے اپنی عظمت شاعرانہ کو خود ہی دنیا کی نظروں سے گرا دیا ہے۔ ہر مشاعرے میں خوش گلو اور ہزل گو شاعر سب سے زیادہ قابل تحسین سمجھا جاتا ہے سامعین اس سے بار بار پلیٹ فارم پر آنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور وہ مہذب مسخرہ سامعین کے قہقہوں کو اپنے لئے عزت و احترام کا سامان سمجھتا ہے"

تقلید کی فرسودہ رسم پر یوں رقمطراز ہیں۔

"شعرائے متقدمین کا احترام میرے دل میں

زیادہ سے زیادہ ہے لیکن کیا ضرورت ہے کہ ہم جادۂ ادب میں ان لوگوں کے نقشِ قدم پر چلیں جن کی منزل عہدِ قدیم ہی میں کہیں ختم ہو گئی ہے! مصحفی، انشا اور سودا کی ہجو نگاری اور مبتذل گوئی انھیں کے زمانوں میں مستحسن سمجھی جاتی تھی۔ آج ہم ان کی ہزلیں اور ہجویں پڑھ کر ہنس تو لیتے ہیں۔ لیکن ان کے تبحرِ ادبی کا اثر ہمارے دلوں پر مطلق نہیں ہوتا۔ میر، درد، غالب کے کلام پر ہمیں ہنسی کیوں نہیں آتی۔ اگر ہمیں تقلید ہی کرنا ہے تو ہم ان شعراء کی تقلید کیوں نہیں کرتے جن کا ادبی وقار آج بھی تعلیم یافتہ طبقوں میں قائم و باقی ہے۔ کیا آپ کے سامنے اقبال، فانی اور حسرت کے ادبی کارنامے نہیں ہیں جو آپ کے زمانے اور موجودہ دور کے شاعر ہیں پھر آپ ان کی تقلید کیوں نہیں کرتے اور ان کا اسلوبِ بیان اختیار کیوں نہیں کرتے۔"

آگے چل کر کہتے ہیں:۔

"میں تو اس دورِ جدید اور اس عہدِ انقلاب میں "تقلید" کو بھی ایک جنسِ مردہ اور متاعِ متروک سمجھتا ہوں! خدا کرے کوئی شاعر ایسا پیدا ہو جو ہمیں قدیم علمِ عروض کی پابندیوں سے بھی آزاد کر کے ہماری شاعری کے لئے نئے آداب و قوانین بنا دے آخر ہم اس روشِ کہنہ اور طریقِ قدیم پر کب تک گامزن رہیں اور کیا ضرورت ہے کہ اپنی ترقی کے لئے نئے راستے نہ ڈھونڈیں"؟

مندرجہ بالا اقتباسات اس بات کے غماز ہیں کہ اردو شاعری جن مسائل سے آج دوچار ہو رہی ہے یہ مسائل نئے نہیں ہیں۔ علامہ سیماب بھی انھیں مسائل سے دوچار رہے ہیں۔

ان دو مضامین کے علاوہ قابلِ ذکر دو نظمیں اس شمارے میں شامل ہیں (۱) ماہر القادری کی نظم "شہیدِ کربلا" اور خیام آندھرا رگھوپتی راؤ جذب عالم پوری کی نظم "دلی میں کیا دیکھا"

جناب ماہر القادری کی نظم شہیدِ کربلا حضرت امام حسین کے مصائب پر صبر و تحمل اور خدا کی راہ میں ایثار و قربانی کے بیان پر مشتمل ہے۔ . . . .

. . . .

... خیام آندھرا حضرت رگھوپتی راؤ جذب کی نظم ایک رپورتاژ کا درجہ رکھتی ہے نظم گو کہ طویل ہے لیکن اس سے اس زمانے کی تہذیب کے علاوہ دلی اور دلی کی چند پر خلوص شخصیتوں سے متعلق بہت سی گم شدہ کڑیاں مل جاتی ہیں۔

"نارجیلستان" کی سب سے اہم تحریر اس کا اداریہ ہے جو معروضات کے عنوان سے لکھا گیا ہے یہ بڑا طویل ہے۔ ہم یہاں ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

"نارجیلستان کا پہلا پرچہ ٹھیک اپنی تاریخ متعین ۲۵ر اپریل سنہ رواں کو شائع ہو گیا تھا اس پر خدائے کارساز کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے جو انسان کے ارادوں کو پورا کرتا ہے۔ کسے خبر تھی کہ کیرالا جیسے علاقے میں جہاں کی مادری زبان ملیالم ہے اور جو اردو مرکز دلی سے ہزاروں میل دور کے فاصلے پر ہندوستان کے جنوبی سرے پر سمندر کے کنارے واقع ہے اور ایک ایسے وسیع صوبے کا ایک ضلع ہے جہاں ایک نہیں چار پانچ وسیع زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ایک کمزور انسان کا تخیل آخر کار عملی حیثیت سے کامیاب ہوگا جس کے بظاہر امکانات نہ تھے اور جو واقعی سرسری نظر سے دیکھنے میں عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔"

"نارجیلستان کا پہلا نمبر ہم نے بامید خریداری یا تعلیمی

حرمت الاکرام

غزل

نہ پوچھ کتنی اذیت میں مبتلا ہوں میں
یہ قہر کم ہے کہ اپنے کو جانتا ہوں میں

نفیرِ وقت سے کہہ دو سمیٹ لے مجھ کو
شکستہ رباب کی بکھری ہوئی نوا ہوں میں

اسی تضاد سے روحِ نمو ہے پائندہ
قتیلِ زیست ہوں پروردۂ فنا ہوں میں

مرے خلوص نے پایا نہ شیوۂ اظہار
چراغِ شہر نہیں گاؤں کا دیا ہوں میں

پرکھ سکو تو پرکھ لو کہ مجھ کو عار نہیں
چھپا سکو تو چھپا لو! یہ چاہتا ہوں میں

مجھے سمجھنے کی دھن ہے تو ڈوبنا سیکھو
بڑے عمیق خیالوں کا سلسلہ ہوں میں

پکار دے کہ زمانہ سنوار لے چہرہ
حیات! تیرے حقائق کا آئینہ ہوں میں

نظر اٹھاؤ کہ کھوئی ہوئی کڑی مل جائے
بہت دنوں سے اک افسانہ کہہ رہا ہوں میں

ٹھہر گیا ہوں کہ پیچھے ہے قافلہ مجھ سے
نہ خستہ پا ہوں نہ حسرت شکستہ پا ہوں میں

اعانت کے خیال سے یا تبصرہ کے لیے جن جن محترم حضرات کی خدمت میں بھیجا تھا ان میں سے اکثر حضرات نے بہت حوصلہ بڑھانے والے خطوط لکھے اور بڑی مسرت سے نارجلیستان کا خیر مقدم کیا ہم ان تمام حضرات کے شکرگزار ہیں۔ اس کے ساتھ ہمیں اکثر اپنے معزز بزرگ ہم عصروں خاص کر شمالی ہند کے اخباروں اور رسالوں کے ایڈیٹر صاحبان سے یہ مخلصانہ اور بجا شکوہ ہے کہ انھوں نے اب تک رسالہ "شاعر" آگرہ کے سوا ہماری حوصلہ افزائی نہیں فرمائی۔"

شمال اور جنوب کی یہ خلیج اب ایک حد تک پاٹ دی گئی ہے۔ رسالے کی پشت پر جلوۂ سخن کا اشتہار چھپا ہے۔ جلوۂ سخن علامہ محوی صدیقی لکھنوی کی ادارت میں مدراس سے نکلا کرتا تھا۔ یہ ماہنامہ تھا۔ نارجلیستان کا زیر نظر شمارہ کل ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ آخر میں یہ عبارت درج ہے۔

"عبدالکریم سیٹھ اختر نے مولوی اصغر حسین کے حقانی برقی پریس مدراس میں چھپوا کر تلچری ملابار سے شائع کیا۔"

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ملابار میں کوئی اردو پریس نہیں تھا اور یہ رسالہ مدراس میں چھپ کر ملابار سے شائع ہوتا تھا اس رسالے کے نکالنے میں سب سے زیادہ کوشش شاید علامہ محوی کی رہی ہے جو کہ اس زمانے میں مدراس یونی ورسٹی کے شعبۂ اسلامیات سے منسوب تھے یہی وجہ ہے کہ اکثر مضامین اور منظومات علامہ محوی کی نکلتی ہی ہیں۔

مضامین اور منظومات کی فہرست پر طائرانہ نظر ڈالنے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ معیار کو اونچا رکھنے کی امکان بھر کوشش کی گئی ہے۔

"نارجلیستان" کے وجود سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ اردو رسائل اور جرائد ہندوستان کے تمام صوبوں سے نکلتے رہے ہیں ہندوستان کی تمام زبانوں میں شاید اردو ہی کو یہ شرف حاصل ہے۔

صفحہ ۱ سے آگے

سید حسین کے اس انداز گفتگو کی وجہ سے الہ آباد میں مشہور ہو گیا تھا کہ کوئی جوان عورت ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی ہے۔

انڈیپنڈنٹ کی ادارت سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ خلافت وفد کے ساتھ انگلستان گئے اور پھر کیلیفورنیا یونیورسٹی امریکہ میں ہندوستانی تاریخ کے پروفیسر ہو گئے اور وہاں سے واپس آکر ہندوستانی حکومت کی طرف سے مصر کے سفیر ہو گئے اور وہیں انتقال کیا۔

رحم علی الہاشمی

تاثرات (۲)

سید حسین

۱۹۲۵ء میں کیننگ کالج لکھنؤ کے ایم اے کلاس میں پڑھتا تھا کہ اس سال کی عالمگیر انفلوئنزا کی وبا میں مبتلا ہو گیا اور نمونیہ ہو گیا۔ کافی دن بیمار رہنے کے بعد جب شفایاب ہوا تو تعلیم جاری رکھنے کی سکت نہ تھی۔ ایک عزیز نے نواب حمید اللہ خاں آف گسمنڈی سے تعارف کرایا جنھوں نے ایک روزانہ اردو اخبار اخوت نکال کر مجھے اور بہار کے فضل الرحمن کو اس کی ادارت سپرد کی لیکن یہ اخبار جلد بند ہو گیا اور اسی دوران میں میں نے سنا کہ اخبار انڈپنڈنٹ الہ آباد کو ادارتی عملہ کی ضرورت ہے تو میں نے خیال کیا کہ یہ موقع اچھا ہے، اخبار میں کام بھی کروں گا اور قانون کی تعلیم بھی حاصل کروں گا۔

چنانچہ میں فوراً الہ آباد روانہ ہو گیا اور وہاں پہنچنے کے دوسرے دن یونیورسٹی اسکول آف لا میں داخلہ لیا اور اسی دن سید حسین ایڈیٹر اخبار انڈپنڈنٹ سے ملا۔ انھوں نے مجھے ایک لکچر دیا اور کہا کہ اگر جرنلزم میں سنجیدگی کے ساتھ داخل ہونا چاہتے ہو تو تمھیں پروف ریڈر ہونا چاہئے، کمپازیٹر اور مشین مین ہونا چاہئے (اس وقت تک لائنوٹائپ یا مونوٹائپ اور روٹری مشین کا ہندوستان میں رواج نہیں ہوا تھا) اخبار کے متعلق سارے دفتری کام سے واقف ہونا چاہئے اور ڈسپیچ وغیرہ کے اوقات کی معلومات رکھنا چاہئے۔ چنانچہ کچھ دن تم اخبار کے مختلف شعبوں میں کام کرو اور اس اثنا میں روزانہ ایک مضمون لکھ کر مجھے دیا کرو اور کبھی یہ نہ پوچھو کہ میں نے اسے کیا کیا۔ چنانچہ میں چار ماہ تک پروف ریڈنگ کرتا رہا اور پھر کمپوزنگ اور مشین وغیرہ کا کام دیکھا اور دفتر کے کاموں سے واقفیت حاصل کی اور روزانہ ایک مضمون لکھ کر انھیں دیتا رہا جسے شاید وہ ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے تھے۔ کچھ دنوں بعد ایک مضمون میں نے اپنے خیال میں بہت اچھا لکھا تھا اور دوسرے دن سید حسین صاحب سے صرف اتنا کہا کہ آپ نے وہ مضمون ملاحظہ فرمایا مگر اس پر وہ بگڑ گئے اور کہا کہ یہ معاہدہ کے خلاف بات ہے تم بس مضمون لکھ کر برابر مجھے دیتے رہو۔ چنانچہ اگر کسی دن میں کسی وجہ سے مضمون نہ لکھ پاتا تو وہ دفتر آتے ہی مجھ سے کہتے تھے کہ پہلے مضمون لکھ کر مجھے دو پھر کوئی اور کام کرو۔ قریب پانچ ماہ بعد میرے ایک مضمون کی سولہ سطریں اخبار میں شائع ہوئیں جس میں بیشتر حصہ ایڈیٹر کی اصلاح کا تھا لیکن اس پر بھی مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں اپنے ساتھیوں کو دکھاتا پھرا کہ میرا مضمون چھپا ہے۔ بعد کو جب میرے مضامین اکثر بغیر ایڈیٹر کی اصلاح کے شائع ہونے لگے تو مجھے اپنے اس سولہ سطری مضمون کی اشاعت پر خوشی کو یاد کر کے ہنسی آجاتی تھی۔ چھ ماہ بعد جب میں باقاعدہ ایڈیٹوریل کمرے میں بیٹھنے لگا تو مجھے بمبئی کراچی کے دو تجربہ کار سب ایڈیٹر مسٹر چندرا اور مسٹر کپاڈیا کے ساتھ رات کی ڈیوٹی پر مقرر کیا گیا۔ یہ لوگ اتنی تیزی سے کام کرتے تھے کہ اکثر میں پریشان ہو کر آبدیدہ ہو جاتا تھا۔ مگر جب میں سید حسین سے اس کا ذکر کرتا تو وہ ناراض ہونے کے بجائے مجھے تسلی دیتے اور کہتے کہ شروع میں اگر محنت نہیں کرو گے تو کام میں مہارت کبھی نہ حاصل ہو سکے گی۔

یہ تھا ان کے ٹریننگ کا انداز جس سے مجھ میں اعتماد پیدا ہوا اور جرنلزم میں جو کچھ بھی میں نے کامیابی حاصل کی وہ اسی کا نتیجہ تھی۔

سید حسین تحریر اور تقریر دونوں میں ماہر تھے اور خاص کر گفتگو کا دل لبھانے والا انداز میں نے سید حسین کے علاوہ صرف سر راس مسعود میں دیکھا لیکن دونوں کا طریق کار مختلف تھا۔ سید حسین چٹکی چٹکی باتوں سے دل لبھاتے تھے اور راس مسعود ہر شخص پر چھا جاتے اور ہر شخص کی علمیت اور استعداد کے مطابق ہر علم و فن پر بے تکان گفتگو کرتے۔

سید حسین کا خط بہت ہی صاف اور ستھرا تھا اور خیالات میں اس قدر پختگی تھی کہ جو لفظ لکھ دیتے تھے وہ اپنی جگہ پر اٹل ہوتا تھا اور سلسلہ وار لکھتے جاتے تھے مگر کہیں کوئی لفظ نہ کاٹتے تھے نہ بدلتے تھے۔ الفاظ و افکار پر اتنا زبردست قابو بہت کم لوگوں میں نظر آتا ہے۔

سید حسین اپنی باتوں سے لوگوں کو کس طرح متاثر کرتے تھے اس کا اندازہ کچھ اس واقعہ سے ہوگا کہ ایک دن میں اپنے رفیق مسٹر ایس رنگا آئر اسسٹنٹ ایڈیٹر سے ملنے گیا تو ان کے یہاں مدراس کے ایک پرانے جرنلسٹ ٹھہرے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں رنگا آئر نے ان سے کہا کہ الہ آباد آئے ہو تو سید حسین سے بھی مل لو۔ انھوں نے بگڑ کر کہا کہ مجھے لونڈوں سے ملنے کا شوق نہیں۔ اس پر رنگا آئر نے انھیں سمجھایا کہ وہ یہاں کے ایک ممتاز آدمی ہیں اگر کوئی ہرج نہیں تو ان سے مل لو چنانچہ بہت کہنے سننے پر وہ راضی ہوئے اور سید حسین سے ملنے چلے۔ ان کے جانے کے بعد رنگا آئر نے مجھ سے کہا کہ تم ذرا ان کی واپسی تک بیٹھو میں تمھیں اڈلی پکا کر کھلاؤں گا۔ چنانچہ میں بیٹھا رہا۔ آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آئے تو مدراسی ہی پورے بیلار کہا کہ رنگا میں نے اتنا شاندار جرنلسٹ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ رنگا آئر نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ دیکھو سید نے کیسا انھیں شیشے میں اتار لیا۔

سید حسین زیادہ پڑھتے نہیں تھے لیکن جس دن ولایت کے اخبار آتے تو وہ سب سے پہلے لندن ٹائمز کھولتے اور اس کے پروگریس آف لٹریچر کا صفحہ پورا پڑھ جاتے اور اس کے بیشتر جو کچھ انھوں نے یورپ میں لٹریچر کی رفتار کا حال پڑھا تھا وہ ان کے ذہن میں محفوظ ہوتا اور اب وہ انگریزی ادب کی تازہ ترین تخلیقات پر حاوی ہو جاتے اور جس سے اس بحث پر گفتگو کرتے وہ یہ سمجھتا کہ انگلستان کے فلیٹ اسٹریٹ سے جو کتاب شائع ہوتی ہے وہ ان کی پڑھی ہوئی ہوتی ہے۔

(باقی صفحہ ۵ پر)

مراسلات

خلیل الرحمٰن اعظمی کے

"میرا صفحہ" کے سلسلے میں

یکم جون ۱۹۷۷ء کے "ہماری زبان" میں جناب خلیل الرحمٰن اعظمی کا مندرجہ بالا مضمون نظر سے گزرا۔ فاضل مضمون نگار نے کافی جرأت سے کام لیا ہے اور بعض تلخ حقائق تفصیل سے بیان کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ ابتدائی اور ثانوی درجات میں اردو کے درس و تدریس میں معلم زلزلے کے سے جھٹکے محسوس کر رہا ہے۔ اوّل تو طلبہ کی تعداد بہت کم، دوم نثر و نظم کی درسی کتابیں معیار سے بہت بلند اور سوم خود معلم کا مبلغ علم جہاں تک اردو نثر و نظم پڑھانے کا تعلق ہے بہت محدود۔ ان حالات میں اردو کی تعلیم کس قسم کی ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ بیشتر طلبہ بت بنے خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ ان کو اس سے کچھ مطلب نہیں کہ درجہ میں کیا پڑھایا جا رہا ہے۔ وہ مطمئن ہیں کہ امتحان میں بہرحال کامیاب ہو جائیں گے اور اس طرح ہائی اسکول یا انٹر کے بعد کم از کم ایک مضمون سے انھوں نے نجات حاصل کر لی ہے۔ تحقیقی اور تنقیدی مضامین ان کے فہم سے بالاتر ہیں۔ مؤلفین حضرات نے نصاب کیا ترتیب دیا ہے گویا مکھی پر مکھی ماری ہے۔ وہی تاریخی تسلسل، وہی قدیم اقتباسات، وہی سودا، ذوق اور میر کے قصیدے اور وہی سحر البیان اور گلزارِ نسیم کے اشعار، وہی باغ و بہار کے ملک نیم روز کے شہزادے کا قصہ اور وہی فسانۂ عجائب کے جانِ عالم کا طوطا خریدنا۔ طلبہ کی کئی پیڑھیاں یہ نثر و نظم کے نمونے پڑھ چکی ہیں۔ اور اب —

ہے جنوں تیرا نیا پیدا نیا ویرانہ کر

نیا بچہ، نیا زمانہ اور نیا استاد۔ ان تینوں کا رشتہ جب تک مربوط نہ ہوگا طالب علم کی حیثیت اندھیری رات میں ایک ایسے مسافر سے زیادہ نہ ہوگی جو راستہ بھول گیا ہو اور جس کے پاس روشنی کا کوئی سامان نہ ہو۔ گذشتہ جنوری میں اتر پردیش کے ایک پرانے اور بڑے گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج میں تعلیمی معائنہ کے سلسلہ میں جانا ہوا۔ انٹر کلاس کے اردو لیکچرار بہت محنتی تھے۔ دوڑ دھوپ کر کے گیارہویں کلاس میں پچیس تیس طلبہ جمع کر لیے تھے۔ جگر کی ایک مشہور غزل پڑھائی جا رہی تھی۔ مولانا نے شعر کا پوسٹ مارٹم تو کر دیا لیکن طلبہ شعر سے لطف اندوز نہ ہو سکے۔ اچھا خاصا غزل کا سبق تو اعدادِ اردو کا سبق ہو گیا۔ نصاب میں انقلابی تبدیلیاں ناگزیر ہیں پرائمری، جونیئر ہائی اور انٹر۔ چاروں منزلوں پر۔ اس کے ساتھ ساتھ استادوں کی اردو پڑھانے کے سلسلہ میں ٹریننگ اور ان کے ریفریشر کورس۔ جب تک یہ نہ ہوگا یونیورسٹی کی سطح پر بھی اردو تعلیم کی بنیادیں کمزور ہو جائیں گی اور اردو داں طلبہ کا ادبی و تہذیبی سرمایہ کم مایہ رہے گا۔ ۱۹۴۷ء سے اب تک یعنی ۳۰ سال میں ابتدائی اور ثانوی درجات میں اردو درس و تدریس کی آثار دھکا لگ چکا ہے کہ اگر فوری اقدامات نہ کیے گئے اور جیسے پرائمری ریڈروں، ادبستان اور بہارستان، ہماری کتاب، اور شاہکارِ نثر و نظم اردو، ادبی سیپارے اور ادب پارے کو نہ تبدیل کیا گیا تو بہت جلد خلیل الرحمٰن اعظمی کے الفاظ میں اردو ایک کلاسیکل زبان ہو جائے گی۔

بشیر علی صدیقی
بریلی۔

ڈاکٹر مسعود حسن خاں اور گئودان

۸ مئی ۱۹۷۷ء کے ہماری زبان میں اردو کے مایۂ ناز ناول گئودان کے متعلق ڈاکٹر مسعود حسن خاں کا نوٹ دیکھ کر سخت افسوس ہوا۔ حیرت ہے کہ موصوف عالی ہندی اردو کے نام نہاد ترجموں کو انگریزی اردو ترجموں کا مترادف سمجھتے ہیں۔ حالانکہ ہندی اردو ترجمہ رسم الخط اور جابجا چند الفاظ کی تبدیلی کے سوا کچھ نہیں۔ اس کام کو حقیقتاً ترجمے کا نام دینا ہی غلط ہے۔ (خصوصاً ناول یا افسانے میں)

پریم چند مسلّم طور پر اردو ادیب تھے۔ انھوں نے بچپن سے اردو پڑھی اور اردو ہی کے زیرِ اثر ان کے ذہن کی تربیت ہوئی۔ ان کی تحریر کا سیاق و سباق سب اردو کا تھا۔ ہندی انھوں نے سیکھی لیکن آخر وقت تک ان کا ناگری املا بھی پوری طرح درست نہ ہو سکا۔ چونکہ اردو عام طور پر جلدی لکھی جاتی ہے اور پریم چند ناگری روانی اور تیزی سے نہیں لکھ سکتے تھے۔ لہٰذا تصنیف کا کام وہ اردو تحریر ہی میں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ بیشتر ان کے بنیادی مسودوں کی زبان بھی اردو ہوتی تھی۔ کیونکہ اردو سے وہ بے تکلف تھے اور ہندی میں انھیں تصنع برتنا پڑتا تھا۔

پریم چند جو کچھ ہندی کے لیے لکھتے تھے اس میں بھی ان کی تحریر صرف اس حد تک ہندی ہوتی تھی کہ کچھ ہندی الفاظ جنھیں وہ خود کسی خاص مفہوم میں لانا چاہتے تھے اردو تحریر میں آ جاتے تھے۔ اس بنیادی مسودے کو لے کر ان کے کوئی دوست مناسب ہندی الفاظ کی ترمیم کے ساتھ ناگری میں منتقل کرتے تھے۔ ناگری مسودے کو خود پریم چند پھر دیکھتے تھے اور اپنے ڈھنگ سے اس کی درستی کرتے تھے۔

آخر میں ان کی ہندی کتابیں پہلے چھپنے لگی تھیں۔ اور اس طرح "گئودان" اردو سے پہلے ہندی میں شائع ہوئی۔ یہی مطبوعہ "گئودان" سحر ورما کو اردو میں منتقل کرنے کے لیے دی گئی۔ لیکن سحر ورما کی تحریر پر خود پریم چند نے نظرِ ثانی کی۔ اس کے بعد وہ اردو میں شائع ہوئی۔ یہ نہ ہوتا تو کتاب پر بحیثیت مترجم سحر ورما کا نام ہوتا۔

پریم چند کی ہر تصنیف خواہ وہ پہلے ہندی میں شائع ہوئی ہو یا اردو میں بنیادی طور پر اردو ہوتی تھی۔ اپنی آخر عمر میں انھوں نے خود دیکھ سکے کہا کہ "سمجھا مجھے ہندی کہاں آتی ہے"۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ہندی کا انداز ان کے اردو زاد ذہن پر گراں گزرتا تھا۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ پریم چند کا سیاقِ تحریر آج تک اردو میں بڑی مشکل ہی سے دھرایا جا سکا ہے۔ سحر ورما خواہ کتنے ہی

قاری کیوں نہ ہو لیکن پریم چند کے انداز تحریر کے قریب سے بھی نہیں جا سکتے تھے۔ وہ صرف پریم چند کی تحریر پر جابجا لغات محاورات اور تذکیر و تانیث پر نظر کرتے تھے۔ جن کی طرف سے درستی پریم چند اپنے طور پر کرتے تھے۔

ہندی پریم چند نہیں جانتے تھے۔ اپنے ناولوں کی ہندی کسی اور سے لکھوانے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پریم چند ایسا عظیم اردو ادیب سحر ہنسوا سے اردو کیوں لکھواتا تھا۔ اس کا سبب اول تو پریم چند کی احتیاط اور نرم طبیعت تھی۔ دوسرے میری یاد میں ایک اور واقعہ ہے جو غالباً اس کا سبب ہو سکتا ہے۔

پریم چند امام حسین کے واقعۂ شہادت سے بے حد متاثر تھے۔ اپنے اسی پر خلوص تاثر کی بنا پر انھوں نے امام حسین کے موضوع پر ایک ڈراما لکھا۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ انھیں ہر طرف سے خراج عقیدت پیش کیا جاتا۔ لیکن اس تصنیف کا ردعمل بالکل مختلف ہوا۔ آج سے نصف صدی قبل ڈرامے کا جو مفہوم مسلمانوں کے ذہن میں تھا اس کے پیش نظر امام حسین کو ڈرامے کے حدود میں لانے پر ایک ہنگامہ ہو گیا۔ پریم چند کی شدید مخالفت کی گئی اور ان پر متعصب آریہ سماجی ہونے کا الزام لگا کر ان کے عقائد پر حملے نہیں کئے گئے۔ ان کے ادب میں بھی زبان و لغات کی غلطیاں نکالی گئیں۔ پریم چند، چکبست نہ تھے جنھوں نے مولوی عبدالحلیم شرر کی آواز بند کر دی تھی۔ وہ بیچارے دیہات کے پرورش یافتہ تھے۔ پھر مزاجاً بھی کمزور واقع ہوئے تھے۔ اس معاندانہ تنقید سے انھیں جو صدمہ ہوا وہ تو ایک طرف تھا ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ ان کا خود اپنی تحریر پر اعتماد بڑی حد تک متزلزل ہو گیا۔ سحر کی مدد وہ صرف اپنے اعتماد کو سہارا دینے کے لیے لیتے تھے۔ ورنہ ظاہر ہے کہاں پریم چند اور کہاں سحر ہنسوا۔

مجھے افسوس ہے کہ اس وقت نہ تو میرے پاس پریم چند کا کوئی ناول ہے نہ ان کے ادب پر مجھے عبور حاصل ہے۔ یہ کام ڈاکٹر جعفر رضا ایسے ذہین ماہر ادب پریم چند کا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف یا انھی کی طرح کوئی دوسرا موضوع کا واقف کار لکھ کر ان کے اس موضوع پر تحقیقی اور تنقیدی انداز میں روشنی ڈالے گا۔ میں نے جو کچھ عرض کیا اس کی بنیاد میرا ذاتی علم ہے۔

پریم چند کی کتابوں کے وہ مسودے جن کو میں بنیادی مسودے کہتا ہوں اگر اس وقت باقی بھی ہوں گے تو ان کا منظر عام پر لانا مشکل ہے۔ پریم چند کی شدھی کر کے ان کو ہندی کا ادیب بنایا جا چکا ہے۔ حالانکہ ان کے عہد کے لوگوں کو خوب معلوم ہے کہ وہ ہندی میں بہت سے بہت ایک خواندہ آدمی کہے جا سکتے تھے۔ ادیب وہ صرف اردو کے تھے۔ خواندہ آدمی اور ادیب میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔

بمبئی۔ صفدر آہ

ایک شعر کے بارے میں

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

اس شعر سے متعلق "ہماری زبان" کے صفحات پر دو ڈھائی سال سے بحث چل رہی ہے اور میں بھی دو چار مرتبہ اس شعر سے متعلق لکھ چکا ہوں۔ ۱۵ رمئی ۱۹۸۱ء کے "ہماری زبان" میں جناب پریم ناتھ صاحب کا مراسلہ نظر سے گزرا۔ جواباً عرض ہے کہ یہ شعر مرزا غالب ہی کا ہے البتہ اسی مضمون سے تعلق رکھنے والا بزم اکبرآبادی صاحب کا شعر یوں ہے ؎

ایک تصویر کسی شوخ کی اور نامے چند
گھر سے عاشق کے پس مرگ یہ ساماں نکلا

غالب کا یہ شعر سب سے پہلے ہمیں اس دیوان غالب کے نسخہ میں ملتا ہے جو نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا اور جس پر ڈاکٹر سید محمود صاحب کا مقدمہ بھی تھا۔ اس شعر سے متعلق جناب شوکت بلگرامی صاحب نے اردوئے معلی ستمبر ۱۹۱۰ء میں یوں لکھا تھا جو قارئین "ہماری زبان" کے لئے درج ہے۔

"اکثر دیکھا گیا ہے کہ دقت پسند طبائع مضامین کی تلاش میں کوسوں نکل جاتی ہیں اور سامنے کی باتیں ان کو نہیں سوجھتیں اگرچہ دیکھا جائے تو دل نشیں وہی باتیں ہوتی ہیں جو دن رات ہم پر گذرتی ہیں اور یہی شعر کی اصل غایت ہے کہ وہ دل لگیں ہوں چنانچہ قدر مرحوم کہتے ہیں ؎

ہم تو اسی شعر کو کہتے ہیں شعر
منہ سے وہ نکلا کہ اثر ہو گیا

یہ بات (یعنی کلام میں اثر) یا تو شعرائے متقدمین کے کلام میں دیکھی گئی ہے یا دور آخر کے سرتاج میرزا غالب کے کلام میں پائی جاتی ہے اور یہی خصوصیت ہے جس نے ان کے کلام کو اوروں سے ممتاز بنا دیا ہے چنانچہ ان کا مطبوعہ دیوان ہمارے اس دعویٰ کا شاہد ناطق ہے۔ میرزا کی ایک مشہور غزل ہے ؎

قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

بعد طبع دیوان اسی زمین میں مرزا نے ایک اور شعر کہا تھا جو میں نے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہے چونکہ یہ شعر دیوان میں نہیں ہے اس لئے نذر ناظرین کرتا ہوں۔ دیکھئے غالب مرحوم نے اپنی انتہائی حسن پرستی اور انتہائی بے سروسامانی کو کس انداز سے بیان کیا ہے اور کیا خوب کہا ہے ؎

"چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط   بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا"

گو شوکت بلگرامی صاحب نے جس بزرگ سے یہ شعر سنا ان کا نام نہیں لکھا ورنہ غالب سے ان کے تعلقات کا بھی اندازہ ہو جاتا۔ پھر بھی میں محققین غالب سے اس شعر سے متعلق تحقیق کی گذارش کرتا ہوں۔

نجم الحسن انجم ادیب

کولابہ

اخبار و افکار

تروپتی میں انجمن ترقی اردو کا قیام

تروپتی میں کچھ اردو دوستوں نے مل کر انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی ہے اور حسب ذیل عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

صدر :۔ جناب نذیر احمد صاحب

نائب صدر :۔ جناب ابوبکر صاحب

معتمد :۔ ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید صاحب

خازن :۔ جناب حیات باشا صاحب

اور مجلس عاملہ میں عبدالعزیز صاحب، قادر باشا صاحب، حافظ زبیر احمد صاحب، ڈاکٹر احتشام احمد صاحب اور جناب شبّر صاحب وغیرہ شامل ہیں۔ • ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید معتمد

اردو کی متوازی جماعتیں

پداپلی :۔ جناب سید انیس الرحمٰن ہاشمی معتمد انجمن ترقی اردو شاخ پداپلی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ عوام کے مطالبہ پر اردو کی متوازی جماعتیں تو قائم کی جاتی ہیں مگر ٹرینڈ اردو داں اساتذہ کا معقول انتظام نہیں کیا جاتا۔ اس جانب محکمہ تعلیم کو اولین توجہ کرنے کی ضرورت ہے بیان میں کہا گیا ہے کہ جے۔ پی۔ ایس (عالیہ یو پی اسکول) پداپلی میں اردو کی اول تا ہشتم جماعتیں جاری ہیں۔ لیکن تاحال ٹرینڈ اساتذہ کے تقرر کی جانب کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ نیز اردو ہفتم جماعت کا قیام بھی ضروری ہے۔ • سیاست

ایک زبان لادنے کی جنونی کوشش سیاسی وحدت کے لئے خطرہ

ترویندرم۔ ممتاز ماہر لسانیات اور انسانیات کے نیشنل پروفیسر ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی نے دراوڑی ماہران لسانیات کی کل ہند کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے مشورہ دیا کہ زبان کے مسئلہ کے سلسلے میں رویہ سیاسی ہونے کے بجائے علمی و سائنسی ہونا چاہئے۔

موصوف نے انتباہ دیا ہے کہ اگر لسانی کٹھ ملاؤں اور جنونیوں نے ہندوستان کے کسی نسلی یا کسی لسانی اور کسی مذہبی سماج پر اپنی زبان کو قومی یا سرکاری زبان کی حیثیت سے لادنے کی کوشش کی تو نہ صرف ملک کی کلچرل یکانگت تباہ ہو جائے گی بلکہ سیاسی طور پر بھی ملک انتشار کا شکار ہو جائے گا۔

ڈاکٹر چٹرجی نے کہا کہ ہند آریوں اور دراوڑیوں میں اولین آمیزش کے زمانے ہی سے باہم لسانی لین دین رہا ہے۔ اگر تامل یا کنڑا سے اس بہت بڑے ہند آریائی عناصر کو خارج کرنے کی کوشش کی گئی جو اس میں موجود ہیں تو یہ کوشش اسی طرح ناکام ہوگی جس طرح ہندی۔ ہندوستانی سے فارسی و عربی کے الفاظ نکالنے کی کوشش ناکام ہوگی۔ • قومی آواز

اردو پوری دنیا کی زبان بن جانے کی صلاحیت رکھتی ہے

بنارس :۔ انڈین کلب (حلقۂ احباب) کے زیر اہتمام کلب کے وسیع میدان میں ایک عظیم الشان مشاعرہ زیر صدارت جناب پرتاپ نرائن سنگھ ایڈوکیٹ منعقد ہوا۔

مشاعرہ کا افتتاح ڈسٹرکٹ ایڈیشنل جج جناب بلرام سنہا نے فرمایا۔ موصوف نے دوران تقریر فرمایا کہ اردو زبان ہماری اور آپ سب کی ہے اور اسی سرزمین کی ہے یہ ہماری قومی امانت ہے اور اس کی ترقی کے لئے جس قدر کوشش کی جائے کم ہے۔ یہ وہ زبان ہے جس کو آج سے ۷سو سال پہلے امیر خسرو نے اپنے کلام کے ذریعہ داغ بیل ڈالی۔ اس زبان کی بڑے بڑے شعراء خدمت کرتے آرہے ہیں اور آج بھی شعرائے کرام یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بنارس بھی اردو ادب کے لئے ایک خاص مقام رکھتا ہے۔

آخر میں صدر مشاعرہ جناب پی۔ این۔ سنگھ صاحب نے فرمایا۔ اردو زبان عرب کی نہیں، فارس کی نہیں بلکہ خالص ہندوستان کی ہے اس زبان میں عربی اور فارسی کے بھی الفاظ ہیں، سنسکرت اور ہندی کے علاوہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کے الفاظ بھی موجود ہیں۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ دنیا کی اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی شامل کئے جائیں۔ کیونکہ اس زبان میں یہ وسعت موجود ہے۔ اگر ہم نے اس میں کامیابی حاصل کر لی تو اردو نہ صرف ہندوستان کی بلکہ پوری دنیا کی زبان بن جائے گی۔ • سیاست

اردو رسم الخط میں تبدیلی کا مشورہ اردو دشمنی ہے

حیدرآباد :۔ اردو کے نامور و مشہور شاعر ساحر لدھیانوی نے انجمن تعمیر ادب کے ایک وفد سے ملاقات میں کہا کہ اردو رسم الخط کو تبدیل کرنے کی کسی بھی قسم کی کوشش اردو دشمنی سے کم نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ اردو زبان کا مزاج اس کے موجودہ فارسی رسم الخط میں ہی ٹھیک ٹھیک ڈھنگ سے پیش کیا جا سکتا ہے اور رسم الخط اتنا مشکل بھی نہیں ہے کہ سیکھا نہ جا سکے۔

انہوں نے اردو مادری زبان والے سرپرستوں اور والدین سے کہا کہ وہ اپنے بچوں کو اردو زبان سے واقف کرائیں اور اس کا رسم الخط ضرور سکھائیں۔

ساحر لدھیانوی نے مزید کہا کہ اردو زبان کو اردو دشمنوں سے

زیادہ اردو والوں سے خطرہ ہے جو اس سے سخت بے حسی اور بے اعتنائی برت رہے ہیں انھوں نے کہا کہ آج کے نوجوانوں اور طلبہ کی بڑی تعداد جہاں اردو زبان سے پوری طرح واقف ہے اور اسے اپنی بول چال میں استعمال کرتی ہے وہیں اس کے رسم الخط سے ناواقف ہے اس عظیم غلطی کی وجہ وہ اردو اور ہندی کے فرق سے ناواقف ہوگئی ہے یہی ناواقفیت اس زبان کے لئے خطرہ کی گھنٹی کہی . . جا سکتی ہے انھوں نے اس بات پر تردد کا اظہار کیا کہ عام بول چال کی زبان کو اردو یا ہندوستانی ہی سے عمداً ہندی کا نام دیا جا رہا ہے یہ ایک بہت بڑی سیاسی چال ہے جو مخالفین اردو بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے چلاتی ہے۔

انھوں نے کہا کہ عام ہندی فلموں کی زبان آسان اردو ہی ہے لیکن سنسر بورڈ سے ہندی کا سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے اس خصوص میں اردو والوں کو نمائندگی کرنی ہوگی۔

ساحر لدھیانوی نے کہا کہ بنیادی طور پر اردو اور ہندی کا کوئی جھگڑا نہیں ہے ہندی کا احترام اور اس کے ارتقاء کا انتظام ضروری ہے لیکن اردو کو نظر انداز کیا جانا بھی غلط ہوگا۔

انھوں نے کہا کہ اردو کا مستقبل اور بھی درخشاں ہے اور وہ پر امید ہیں لیکن ضروری ہے کہ اردو والے اس سے بے حسی نہ برتیں۔

، الجمعیۃ دہلی

نظام آباد میں اردو ہال کی تعمیر کا مطالبہ

حیدرآباد:۔ ادارہ ادب نظام آباد کے سالانہ ادبی اجلاس اور مشاعرہ میں ایک قرارداد کے ذریعہ بلدی حکام سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اردو ہال نظام آباد کی تعمیر کے لئے زمین الاٹ کریں اس قرارداد کے محرک جناب جمیل الرحمٰن میونسپل کونسلر تھے۔ دوسری قرارداد کے ذریعہ ارباب ریڈیو حیدرآباد سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اضلاع کے شعراء کو بھی نیرنگ پروگرام میں موقع دیں۔ اس اجلاس کی صدارت جناب ایم۔ گنگا ریڈی ایڈوکیٹ نے کی انھوں نے صدارتی تقریر میں اردو کو ہندوستانی زبان قرار دیتے ہوئے اس کی ترقی کو قومی یکجہتی کے فروغ کے لئے ضروری قرار دیا۔

● سیاست

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کا خط و کتابت اردو کورس

۱۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ جامعہ نگر نئی دہلی کے جشن زریں (گولڈن جوبلی) کے موقع پر اس کورس کے انتظام کی ابتدا کی گئی ہے۔

۲۔ اس کورس کا مقصد مختلف زبانوں کے ذریعہ خط و کتابت کے سہارے اردو کی ابتدائی تعلیم دینا ہے۔

۳۔ توقع کی جاتی ہے کہ سیکھنے والا عام فہم اردو بول سکتا ہو اور سمجھ سکتا ہو۔

۴۔ سیکھنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ کوئی ایک زبان لکھ پڑھ سکتا ہو۔

۵۔ فی الحال ہندی کے ذریعہ تعلیم دینے کا انتظام کیا گیا ہے۔

۶۔ اس کے نصاب کے مطابق کتابیں تیار کی گئی ہیں۔ شرکت کے قواعد کے متعلق جامعہ ملیہ سے خط و کتابت کیجئے۔ ● الجمعیۃ

مسلمانوں میں تعمیری سرگرمیوں کو ترقی دینے کے لئے ایک آل انڈیا فورم کے قیام کا منصوبہ

ہندوستان کے مسلمانوں کی تعمیری سرگرمیوں اور ویلفیر کو ترقی دینے کے لئے ایک آل انڈیا فورم کے قیام کی تجویز جامعہ ملیہ کے جشن زریں کے موقع پر ایک سیمینار میں کی گئی تھی۔ اس کے لئے سیمینار نے ایک ایڈہاک کمیٹی مقرر کی تھی۔

اس ایڈہاک کمیٹی کا ایک جلسہ یکم جنوری ۱۹۷۱ء کو جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب کی صدارت میں جامعہ اسکول آف سوشل ورک کے کانفرنس ہال میں ہوا۔ جلسہ میں آل انڈیا فورم کے دستوری خاکہ کی منظوری کے علاوہ یہ طے پایا کہ مسلمانوں میں سوشل ویلفیر کا کام کرنے والی ایجنسیوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس حیدرآباد میں دسمبر کے آخری ہفتہ میں بلائی جائے اس کانفرنس کا انتظام کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ مقامی لوگوں پر مشتمل ایک استقبالیہ کمیٹی بنا کر اس کانفرنس کا انتظام کرے۔

کانفرنس کا پروگرام تیار کرنے کے لئے ایک اور سب کمیٹی جناب ڈاکٹر سید عابد حسین کی قیادت میں بنائی گئی تھی۔

جامعہ اسکول آف سوشل ورک کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ مسلمانوں میں کام کرنے والی ویلفیر ایجنسیوں کی ایک ڈائرکٹری جلد سے جلد تیار کرے تاکہ ان کے کاموں کی نوعیت کو سامنے رکھ کر ان کے نمائندوں کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی جاسکے۔

سیمینار کے فیصلے کے مطابق مجوزہ آل انڈیا فورم سیکولر بنیادوں پر قائم کیا جائے گا اور اس میں وہ تمام جماعتیں شامل ہو سکتی ہیں جو ہندوستان کی قومی ترقی کے لئے مسلمانوں میں تعمیری سرگرمیوں اور ویلفیئر کے کاموں کو پھیلانا ضروری سمجھتی ہیں۔

اس کام سے دلچسپی رکھنے والے حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مندرجہ ذیل پتہ پر ایسی سوشل ویلفیئر ایجنسیوں کے نام اور پتے جلد بھیج دیں جو مسلمانوں میں تعمیری کام کر رہی ہیں۔

• شمس الرحمٰن محسنی

پرنسپل جامعہ اسکول آف سوشل ورک

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام آل انڈیا مشاعرہ

حیدرآباد، ادبی ٹرسٹ حیدرآباد کے زیر اہتمام ایک مشاعرہ زیر صدارت علامہ حیرت بدایونی منعقد ہوا۔ ابر و باد کے طوفانی موسم کے باوجود اس مشاعرہ میں شعر و سخن کے ہزاروں پرستاروں نے شرکت کی۔ اس میں ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، خمار بارہ بنکوی، نازش پرتاپ گڑھی، مینا قاضی، زبیر رضوی، سلیمان خطیب اور دکنی زبان کے شاعر نظیر دہقانی، جاں نثار اختر، اور جگن ناتھ آزاد کے علاوہ دیگر متعدد نامور شعرائے کرام نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ طوفانی ہواؤں کے باوجود سامعین اپنی جگہ پر بیٹھے رہے مگر کالی گھٹا کے برسنے پر بادل ناخواستہ مشاعرہ کے اختتام کا اعلان کرنا پڑا۔

منتظمین مشاعرہ نے موسم کے تیور دیکھ کر کچھ ایسا اہتمام کیا تھا کہ سامعین نے مختصر سے وقت ہی میں تمام بیرونی شعراء کو سن لیا۔

اس مشاعرہ کی صدارت مرکزی نائب وزیر جناب فہیم الحسن محسن نے قبول فرمائی تھی۔ اگرچہ موصوف تشریف لے آئے تھے مگر خراب موسم کی بنا پر مشاعرہ ملتوی ہو جانے کی وجہ سے بربنائے مصروفیت ان کو جانا پڑا۔

مشاعرہ کا آغاز مخدوم کی ٹیپ کی ہوئی ایک نظم سے ہوا۔ ٹرسٹ کے صدر نشین جناب ایل این گپتا آئی اے ایس نے اپنی خیر مقدمی تقریر میں ٹرسٹ کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ گذشتہ ۳ مشاعروں اور دعوتوں وغیرہ کے ذریعہ ۹۰ ہزار روپیہ جمع کر لئے گئے ہیں۔ جناب گپتا نے حیدرآباد میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ مشاعرہ کے سلسلہ میں ایک خوب صورت سووینیر بھی شائع کیا گیا تھا۔

• عابد علی خاں

(صفحہ ۱۲ سے آگے)

لکھا گیا ہے اور دو جگہ صحیح یعنی "چڑھانا" لیکن ہندی کے تلفظ میں یکسانیت ملتی ہے یعنی ہر جگہ "چڑھانا" ہے۔

گئو دان کے مترجم کا یہ خیال بھی غلط ہے کہ اردو میں کاف بیانیہ (کہ) کے بغیر جملے نہیں بنائے جاتے، چنانچہ پریم چند کے ہندی کے وہ جملے جن میں کاف بیانیہ حذف ہے اردو میں جوں کے توں رکھے جا سکتے ہیں لیکن مترجم کاف بیانیہ سے لکھتا ہے۔ مثلاً "گوبر نے دیکھا، سارا سامان کھلا پڑا ہے" اردو میں اس طرح لکھا گیا ہے: "گوبر نے دیکھا کہ سارا سامان کھلا پڑا ہے۔" اور اس طرح جملے کی ساری ڈرامائی بلاغت کا خون کر دیا گیا ہے۔

اردو گئو دان کی زبان کا جس قدر گہرائی سے مطالعہ کیا جائے گا یہ بات واضح ہوتی جائے گی کہ اس میں مترجم کا زبردست "دستِ غیب" ہے۔ چوں کہ ہندی اردو ایک ہی زبان کے دو روپ ہیں اس لئے اس میں ترجمہ کا پردہ کم سے کم حائل رہتا ہے۔ تاہم ایک تخلیقی فنکار کے قلم کی نیابت ایک مترجم سے نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اردو گئو دان کی زبان جابجا غمازی کرتی ہے کہ اس کے گوہر آبدار تخلیقی عمل کی لہر پر آبدار نہیں ہوئے ہیں بلکہ ایک مترجم کی کاوش غواصی کے آوردہ ہیں۔

اردو مسئلہ کا حل جمہوری رائے عامہ کو ہموار کرنا ہے

ڈاکٹر محمد حسن ریڈر دہلی یونیورسٹی نے انجمن انیس ادب کی ایک ادبی نشست میں اردو کے مسئلہ پر بات کرتے ہوئے کہا کہ "یہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اسے دوسری سرکاری زبان بنانے کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس سے اردو داں طبقہ کے لئے روزگار کے نئے دروازے کھلیں گے نئے وسائل پیدا ہوں گے۔"

لوک سبھا کے الکشن سے پہلے ممبران پارلیمنٹ کا جو وفد وزیر اعظم سے ملا تھا اور نیشنل ویژن پروگرام سے انھوں نے جو انٹرویو لیا تھا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "جو بات میں نے اس وقت کہی تھی وہی بات آج بھی مجھے کہنا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "اردو کے مسئلے کو یہ کہہ کر پس پشت ڈال دینا کہ اگر اردو کا سوال اٹھایا گیا تو فرقہ وارانہ فسادات ہوں گے انتہائی غیر منطقی دلیل ہے، سوائے دو ایک پارٹیوں کے ہر پارٹی اپنے انتخابی منشور میں اعلان کر چکی ہے اردو کو اس کا جائز مقام دیا جائے گا۔" انھوں نے کہا کہ "جائز مقام بہت مبہم ترکیب ہے۔ یہ دور عوامی مطالبات کے پیچھے جمہوری حمایت حاصل کرنے کا ہے، ۹۱ء میں صوبائی اسمبلیوں کے لئے انتخابات ہونے والے ہیں اس موقع پر جمہوری رائے عامہ ہموار کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔"

• قومی آواز

پروفیسر مسعود حسین خاں

ہمارا صفحہ

گئودان

ہماری زبان کے ۱۵ دسمبر ۷۰ اور ۸ مئی ۷۱ کے شماروں میں پریم چند کے اردو ناول "گئودان" کے بارے میں خارجی شواہد کی بنا پر ہم نے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس کی حیثیت محض ترجمہ کی ہے اور مترجم کی حیثیت سے اس کی ذمہ داری اقبال ورما سحر صاحب پر عائد ہوتی ہے۔

موجودہ قسط میں داخلی اور لسانی شواہد سے یہی بات ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ اردو گئودان کی زبان پریم چند کی نہیں بلکہ اس کے مترجم کی ہے۔ پریم چند دولسانی مصنف تھے۔ انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز اردو مصنف کی حیثیت سے کیا تھا اور اردو ہی ان کی "پہلی زبان" تھی۔ رفتہ رفتہ بوجوہ (اور یہاں صرف معاشی وجوہ ہی کی جانب اشارہ کافی نہیں بلکہ تہذیبی اور سیاسی اسباب بھی پیش نظر ہیں) وہ ہندی نویسی کی جانب مائل ہوتے گئے۔ حتی کہ آخری دور کے بیشتر افسانے اور ناول انھوں نے پہلے ہندی میں قلمبند کیے اور پھر ان کا ترجمہ خود کیا یا اقبال ورما سحر صاحب سے کروایا۔ ہندی گئودان کی تصنیف کے بعد وہ مسلسل علیل رہے اور اس کے ترجمے کی نظر ثانی کے لیے وہ اس قدر وقت بھی نہ نکال سکے جس قدر کہ دوسری ناولوں کے ترجموں کو دیا تھا۔

لسانی تجزیہ کے لئے ہمارے پیش نظر گئودان کا اکیسواں باب ہے۔ صرف اس ایک باب کے تجزیے سے اس بات کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کسی دولسانی مصنف کی اصل تحریر نہیں بلکہ کسی دوسرے شخص کا ترجمہ ہے۔ جب کہ دولسانی مصنف (اور وہ بھی پریم چند جیسا) اپنی ایک زبان کی تصنیف کو دوسری زبان میں کرتے وقت تخلیقی صلاحیتوں کو اور اس قدرت کو جو اسے دونوں زبانوں پر ہوتی ہے ایک لمحہ کے لئے فراموش نہیں کرتا، مترجم الفاظ اور تراکیب کا قالب بدلتے وقت محض ترجمہ پر اکتفا کرتا ہے۔ مصنف اور مترجم کا یہ فرق "گودان" اور "گئودان" کے سلسلے میں زیادہ نمایاں ہو جاتا اگر اقبال ورما سحر خود دولسانی مترجم نہ ہوتے۔ دولسانی ہونے کی وجہ سے "ترجمہ پن" کی کیفیت کو کسی حد تک کم کرنے میں کامیاب رہے ہیں تاہم ان کو زبان کے تخلیقی عمل پر وہ قدرت نہیں تھی کہ "گودان" کے سہارے "گئودان" کی تخلیق کر سکیں۔ چنانچہ اس باب میں انھوں نے ہندی کے بعض فقروں کا ترجمہ اس انداز میں کیا ہے:

گودان (ہندی)	گئودان (اردو)
(۱) اس کا رکت کھول رہا تھا۔	اس کا خون اُبل اٹھا۔
(۲) روٹیاں پکائی تھیں۔	روٹیاں بنائی تھیں۔
(۳) ہوری نے دھنیا کو سجل نیتروں سے دیکھا۔	دھنیا کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھ کر۔
(۴) ایک جون تو چبینے پر ہی کٹتا تھا۔	ایک وقت تو چربن ہی پر کٹتا تھا۔
(۵) اور کوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھنگیت کا گپت دان کر رہی تھی۔	اور کوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داتوں کی خفیہ خیرات تقسیم کر رہی تھی۔
(۶) آہت اُبھی مان کے ساتھ	زخم کھائے ہوئے تکبر سے
(۷) یَنتر کی سی اندھ شکتی	مشین کی سی کورانہ طاقت

اس قسم کی مثالوں میں بآسانی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اردو کے روزمرہ سے واقف قاری خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ اردو محاورہ "خون کھولنا" ہے یا "خون اُبلنا"، "روٹیاں پکانا" ہے یا "روٹیاں بنانا"، "آنسوں بھری آنکھیں" ہے یا "ڈبڈبائی آنکھیں"، "چربن" ہے یا "چبینا"۔ ترجمہ کی غرابت "داتوں کی خفیہ خیرات" اور "مشین کی سی کورانہ طاقت" سے بھی ظاہر ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ گئودان کا مترجم ہمیشہ اس بات پر تلا نظر آتا ہے کہ پریم چند کے استعمال کئے ہوئے عام مستعمل لفظ کا بھی بدل ڈھونڈھ نکالے چاہے وہ لفظ اردو والوں کے لئے کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو۔ بعض اوقات وہ یہ فیصلہ تک نہیں کر سکتا کہ لفظ کی کون سی شکل استعمال کرے اور کون سی ترک۔ مثلاً ہندی میں پریم چند نے ہر جگہ "اوکھ" کا لفظ استعمال کیا ہے، مترجم اس باب میں دو جگہ "اوکھ" لکھتا ہے اور دو جگہ اس کی دوسری شکل "اکھیو"۔ اگر پریم چند نے اس باب کو اردو میں لکھا ہوتا تو یقیناً وہ "اکھیو" کی یکسانیت کو برقرار رکھتے کہ اردو والے بیشتر لفظ کی اسی شکل سے واقف ہیں اور معیاری ہندی ٹنک کے قاعدوں میں [ ] سے "اکھیو" لکھا گیا ہے۔

یہی صورت ہندی لفظ "چڑھانا" کی ہے جو اردو میں "چڑانا" ہے۔ اس باب میں اردو میں دو جگہ "چڑھانا" غلط

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر و پبلشر سید تفضل حسین ایم اے نے لیتھو کلر پریس علی گڑھ میں چھاپا اور دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع کیا

REGD.NO.L. 922 فون نمبر ۲۹ R-NO-2186/57